محمد علی صدیقی کی تنقیدی جہات کا اجمالی جائزہ

ڈاکٹر محمد فرید احمد

Dr. Muhammad Fareed Ahmad

Assistant Professor, Department of Urdu,
Govt. Municipal Degree College, Faisalabad.

نائلہ ارم

Naila Iram

Assistant Professor,
Govt. Girls Degree College, Faisalabad.

Abstract:

Muhammad Ali Siddiqui is a renowned critic of progressive movement in Urdu literature. His scientific way of criticism possesses a clear and vivid opinion about any topic which he discusses. He wrote about modern theories like structuralism, post structuralism, modernism and post modernism as well. He is of the view that literature should be true replica of life, that is why, global issues of humanity gets maximum room in his whole work of criticism. His moderate approach not only expanded the circle of Urdu criticism but also supported the doctrine of progressive movement after the creation of Pakistan.

جدید اُردو تنقید کی روایت میں ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی اہمیت کئی حوالوں سے ہے۔ وہ جدید ترقی پسند روایت کے بانی ہیں جنھوں نے ترقی پسند تحریک کی ختم ہوتی ہوئی ساکھ کو نہ صرف سہارا دیا بلکہ اپنے وسیع تر مطالعاتی، تجزیاتی، استدلالی، تقابلی تحقیقی وتنقیدی سائیٹفک تنقیدی نقطۂ نظر سے ترقی پسند تحریک کی آواز اور نظریے کو ادبی حلقوں میں زندہ کر دیا۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے گذشتہ صدی کی چھٹی دہائی سے تنقید مضامین لکھنا شروع کیے۔ نصف صدی سے زائد عرصہ پر محیط ان کے لکھے ہوئے الفاظ اور پیش کیے گئے نظریات خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ مغربی ادبیات تک رسائی کے ساتھ جدید تحریکوں

سے متعلق ان کے پیش کردہ نظریات جدید ترقی پسند تحریک کی اساس ہیں۔ لسانیات اور سماجی علوم کے بارے میں ان کا مطالعہ بہت وسعت کا حامل ہے۔ انھوں نے جدید تنقیدی رجحانات کو اُردو تنقید میں متعارف کروانے اور وسیع علمی و تہذیبی تناظر عطا کرنے میں اہم کردار کیا۔ محمد علی صدیقی نے نظری اور عملی تنقید کے باب میں اپنی آواز کو مستند حوالے کے طور پر شامل کیا۔ فکشن، شاعری، مصوری، ادبی مسائل و تاریخ اور ہر شعبۂ ادب ان کی تنقیدی فکر کا حصہ بنا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے لیے ان کی خدمات ایک مقلّد کی نہیں بلکہ ایک مجتہد کی ہیں۔ انھوں نے ترقی پسند تحریک کو اس وقت ثروت مند بنایا جب ترقی پسند تحریک کو جدیدیت پسندوں شمس الرحمان فاروقی، شمیم حنفی، ابوالکلام قاسمی، قاضی افضال اور ابتدائی مخالفوں باقر مہدی، وارث علوی، وحید اختر اور مہذب اختلاف کرنے والے ناقدین آل احمد سرور، خلیل الرحمان اعظمی کی مخالفت کا سامنا تھا۔ محمد علی صدیقی کی تنقیدی خدمات کی تعریف نہ صرف ترقی پسند ناقدین نے کی بلکہ ترقی پسند تحریک سے اختلاف رکھنے والوں نے بھی کی ہے۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی اب تک اٹھارہ تصانیف، تالیفات شائع ہو چکی ہیں جن میں ''توازن'' (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) ۱۹۷۶ء، ''کروچے کی سرگزشت'' (ترجمہ) ۱۹۷۹ء، ''نشانات'' (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) ۱۹۸۱ء، ''مضامین'' (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) ۱۹۹۱ء، ''اشاریے'' (افکار میں شائع شدہ مضامین کا مجموعہ) ۱۹۹۲ء، ''سرسید احمد خان اور جدت پسندی'' ۲۰۰۶ء، ''غالب اور آج کا شعور'' ۲۰۰۶ء، ''ادراک'' ۲۰۰۷ء اور ''توازن کی جہات'' (مرتبہ: ڈاکٹر قاضی عابد'' ۲۰۰۷ء، ''فیض احمد فیضؔ، درد اور درماں کا شاعر'' زیادہ نمایاں ہیں۔

چالیس سال سے زائد ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے روزنامہ ''ڈان'' میں ایریل کے قلمی نام سے ادبی و تنقیدی مضامین لکھے۔ ان کے مضامین ''جامِ نو''، ''افکار''، ''سیپ''، ''نئی قدریں''، ''فنون''، ''اوراق''، ''نیرنگِ خیال''، ''تخلیق اور ارتقا'' جیسے ادبی رسائل میں متواتر چھپتے رہے ہیں۔

محمد علی صدیقی کی تنقید سے متعلق نمایاں اور منفرد پہلوؤں کا اگر جائزہ لیا جائے تو اُن کی پہلی اور منفرد پہچان ان کا بطور ترقی پسند ناقد ہونا ہی سامنے آتا ہے۔ وہ ادب کا جائزہ سماجی، سیاسی، تہذیبی، معاشی اور معاشرتی پس منظر میں لیتے ہیں۔ اسی لیے ان کے بہت سے موضوعات کے نام ہی ان کے سماجی تناظر میں مطالعہ کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جیسے ''امیر خسرو، سیاسی و سماجی پس منظر''، ''ترقی پسندی کی ایک جہت اقبال''، ''قاسمی کی شاعری کا فکری پس منظر''، ''اسرار الحق مجاز۔ انقلاب کا نغمہ گر''، ''شاہد نقوی اور عصری آگہی کی شاعری''، ''بہادر شاہ ظفر متاعِ درد کا شاعر''، ''حبیب جالب۔ شاعرِ شعلہ نوا''، ''مرتضٰی برلاس۔ نوائے تلخ کا مغنی'' اور ''فیض احمد فیض۔ شاعرِ درد و درماں'' وغیرہ۔ جن موضوعات کے نام سماجی تناظر کے نہ بھی عکاس ہوں ان موضوعات میں سماجی، سیاسی، تاریخی، معاشی، معاشرتی یا تہذیبی پہلوؤں کو ہمیشہ انھوں نے اولین ترجیح دی ہے۔ وہ ہر فن پارہ پر تنقید

کے حوالے سے بھی سماجی، تاریخی تناظر کی اہمیت کے قائل ہیں۔ وہ سماجی تناظر کی بابت رقم طراز ہیں:

''میرا خیال ہے کہ ہر فن پارہ اپنے زمانہ کی سماجی اور سیاسی فکر سے دیدہ و نادیدہ، اقرار یا انکار کا رشتہ قائم کرتا ہے اور ان ہر دو صورتوں کے پیشِ نظر فن پارہ کے فنی محاسن و معائب میں بھی ہم عصری رویوں کی جھلک پائی جاتی ہے۔'' (۱)

محمد علی صدیقی وسیع تر مطالعہ کے حامل نقاد ہیں۔ اگرچہ وہ اپنی تنقید کو سماجی تہذیبی اور تاریخی قدروں پر استوار کرتے ہیں مگر ان کے تجزیے سائنسی اور معروضی ہوتے ہیں۔ انھوں نے جتنے بھی مضامین تحریر کیے ہیں ان کی نوعیت سائنٹفک اور ترقی پسندانہ ہے۔ ان کے نزدیک اس سائنٹفک تنقیدی طریقے کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ فکری طور پر نامعلوم کے دائرہ کو کم سے کم دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے موضوعات میں بہت زیادہ وسعت ہے۔

محمد علی صدیقی تنقید میں تقابلی مطالعے کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے موضوعات زیادہ تر تقابلی مطالعے کی خصوصیات کے حامل ہیں۔ جیسے سرسید اور اقبالؔ، ''مجدد الف ثانی، اقبالؔ اور تصوف''، ''اقبالؔ اور حلاج''، ''غالبؔ اور اقبالؔ۔ ایک تقابلی جائزہ''، ''غالبؔ، جوشؔ اور فیضؔ۔ تین آوازیں تین لہجے''، ''غالبؔ اور یگانہ چنگیزی''، ''میرؔ اور غالبؔ'' اور ''غالبؔ اور فیضؔ'' وغیرہ، جن موضوعات کے نام تقابلی مطالعہ سے نہ بھی شروع ہوں وہ ان موضوعات میں دلائل دیتے ہوئے تقابل ضرور کرواتے ہیں جو ان کے وسیع تر مطالعہ کے ساتھ ان کے تقابلی و تجزیاتی تنقیدی نکتۂ نظر کی طرف اشارہ ہے۔ اس طرح متعلقہ موضوع کو سمجھنے کی زیادہ بہتر صورت قاری تک پہنچتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی شاعری کا ایک تقابلی انداز کچھ اس طرح ہے:

''قاسمی کی شاعری نہ فیض کی طرح مترنم اور ایمائی ہے اور نہ میرا جی کی طرح فرانسیسی و آریائی، نہ راشد کی طرح فکر و خیال کے چمنستانوں کو جنم دیتی ہے۔'' (۲)

اگر تنقید میں تحقیقی انداز کی بات کی جائے تو ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی تنقید تحقیقی خصوصیات کی حامل ہے۔ وہ کسی بھی موضوع پر بات کرتے ہیں تو محض سنے سنائے الفاظ یا بیان پر اکتفا نہیں کرتے۔ اچھے محقق کی طرح مطلوبہ نظریے کی بنیاد تک اپنے وسیع تر مطالعہ کی بدولت رسائی کرتے ہیں۔ ان کا یہی تحقیقی پہلو متقدمین اور معاصرین سے اختلافِ رائے کا بھی ذریعہ ہوتا ہے۔ بہت سے غالبؔ شناسوں نے غالبؔ کی شاعری پر ۱۸۵۷ء کے اثرات دیکھے اور اب تک اس بات پر قائم ہیں مگر محمد علی صدیقی نے ان کے اس نظریے سے اختلاف کیا ہے اور اپنے تحقیقی اندازِ نقد سے ثابت کیا کہ غالبؔ کی تمام تر شاعری ۱۸۵۷ء سے پہلے کی شاعری ہے تو اس پر ۱۸۵۷ء کے اثرات کیونکر ہو سکتے ہیں۔ پھر فاضل ناقد نے اپنے تحقیقی طریقۂ تنقید سے ثابت کیا کہ غالبؔ علمِ نجوم کے ماہر تھے اور یہ خصوصیت اُردو شاعری میں کسی بھی شاعر کو اس طرح حاصل نہیں اور یہ کہ غالب نے جو علمِ نجوم کی بابت پیش گوئیاں کی ہیں وہ زیادہ تر

حقیقت سے قریب تر ہیں۔ ڈاکٹر انوار احمد اپنے ایک مضمون ''محمد علی صدیقی۔ اُردو تنقید میں ایک معتبر نام'' میں محمد علی صدیقی کی اسی تحقیقی و تنقیدی خصوصیت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کرتے ہیں:

> ''صدیقی، غالب کے فارسی قصیدہ، ہشتم اور نواب سعد الدین خان شفق کے نام غالب کے مکتوب کے اقتباس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ غالب علمِ نجوم میں دستگاہ رکھتے تھے اور پھر تفتہ کے نام غالب کے اس خط سے وہ نکتہ نکالتے ہیں جواب تک مسلمہ غالب شناسوں کے ہاں میں نے نہیں دیکھا۔''(۳)

ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی تنقیدی خصوصیات میں ایک خوش آئند پہلو یہ ہے کہ وہ اپنی منفرد تنقیدی رائے کے بھی حامل ہے۔ یہ نہیں کہ بات کا آغاز کیا اور درمیان میں چند ناقدین کی آرا پیش کیں اور باقی معاملہ قاری پر چھوڑ دیا یا بحث کا کوئی نتیجہ نہیں نکالا۔ وہ بات کا آغاز کرتے ہیں اور تمام بحث مکمل طور پر اپنی تنقیدی اور تحقیقی رائے سے آگے بڑھاتے ہیں اور پڑھنے والے کو کسی نہ کسی منطقی نتیجے تک ضرور لے کر آتے ہیں۔ غالبؔ کو اقبالؔ کے مقابلے میں گوشت پوست کا شاعر قرار دیتے ہیں جب کہ اقبال کی شاعری کو ''کیا ہے'' سے زیادہ ''کیا ہونا چاہیے'' قرار دیتے ہیں۔ پھر غالبؔ، جوشؔ اور فیضؔ میں قدرِ مشترک ان تینوں کی 'جدید فکر' کو تلاش کرتے ہیں۔ اقبالؔ کو اس لیے ترقی پسند قرار دیتے ہیں کہ اقبال نے اسلام کا جدید نقطۂ نظر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ پھر سرسید کی فکر کی عظمت کو ان کے عصر کے تناظر میں متعین کرتے ہیں۔ تشکیل، ردِ تشکیل اور لسانیات کی تمام تر بحثوں سے اختلاف کرتے ہوئے زبان کو خیالات اور محسوسات کے اظہار کا وسیلہ قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے بہت سی علمی و ادبی شخصیات اور ان کے کلام پر تبصرے بھی تحریر کیے ہیں۔ ان تبصروں کی تنقیدی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ مذکورہ شخصیات اور ان کی کتب پر رائے محمد علی صدیقی کی تنقیدی بصیرت کی عکاس ہیں۔ وہ تنقید میں سماجی تناظر کے قائل ہیں اس لیے وہ کسی بھی نظریے یا تحریر و کتب پر بات کریں تو سماجی تناظر کو نظر انداز نہیں کرتے۔ وہ بے لاگ رائے کے حامل ناقد ہیں۔ دیباچوں میں بھی وہ تمام تر پہلوؤں کا احاطہ کرتے نظر آتے ہیں۔ دیباچہ پڑھتے ہی اس کتاب یا ادبی شخصیت کے فکر و فن بہت حد تک پڑھنے والے پر واضح ہوجاتے ہیں۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کی تصنیف ''رجحانات'' پر لکھے گئے دیباچے ''طاہر تونسوی۔۔۔سماجی دبستان کا نقاد'' میں ڈاکٹر طاہر تونسوی کے تحقیقی و تنقیدی اندازِ نقد کو یوں پیش کرتے ہیں:

> ''ڈاکٹر طاہر تونسوی نئے نقادوں کے اس مختصر گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو تحقیق اور تنقید کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں تقسیم نہیں کرتے اور اپنے تنقیدی نقطۂ نظر کو تحقیق کے آئینے میں دیکھتے اور پرکھتے ہیں۔''(۴)

اکثر تنقید کی زبان خشک اور غیر دل چسپ ہوتی ہے جس کی شاید ایک وجہ موضوعات کا مشکل

ہونا بھی ہو مگر محمد علی صدیقی تنقید کی زبان کو تخلیقی انداز میں پیش کرنے کی خوبی رکھتے ہیں۔ کہیں کہیں ان کی تنقید کی زبان میں دِقت پسندی کا احساس ہوتا ہے جس کی ایک وجہ ان کے موضوعات کا انتخاب بھی ہو سکتا ہے مگر ابلاغ کا سلسلہ کامیاب رہتا ہے۔ ان کی تنقید میں تخلیق کی سی خوبی بھی موجود ہے۔ وہ اپنے تخلیقی انداز سے تنقید میں دل کش اسلوب کی چاشنی پیدا کر دیتے ہیں۔ ''ابنِ انشا۔ ایک مطالعہ'' میں ابنِ انشا کی شاعری اور کالم نگاری سے متعلق ایک خوب صورت انداز ملاحظہ ہو:

''بحیثیت شاعر وہ ایک ممتاز شخصیت تھے لیکن شاعری نے انھیں صرف شہرت دی تھی جب کہ کالم نگاری نے انھیں سفالِ کوزہ گر کی جگہ خود کوزہ گر بنا کر رکھ دیا۔''(۵)

محمد علی صدیقی کا تنقیدی انداز سائنٹفک ہے۔ وہ ہر پہلو کی کھوج لگاتے ہیں اور زیرِ بحث موضوع کی ابتدا کا سراغ لگاتے ہوئے اس کی موجودہ صورت تک کی تمام صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہیں جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ہر موضوع پر بات کرنے سے متعلق اس موضوع کا براہِ راست مطالعہ کرتے ہیں اور پھر سائنٹفک تنقیدی طریقے کی بدولت کسی منطقی انجام تک پہنچتے ہیں۔ گلزارِ جاوید ایک انٹرویو میں جب محمد علی صدیقی سے یہ سوال پوچھتے ہیں کہ ''آپ کے مزاج میں سائنسی رویہ کیوں دخیل ہے؟'' تو وہ اس کا جواب یوں دیتے ہیں:

''میں فکری طور پر ''نامعلوم'' کے دائرہ کو کم سے کم دیکھنا چاہتا ہوں۔''(٦)

روایتی ترقی پسندوں کے برعکس ڈاکٹر محمد علی صدیقی کشادہ ذہن اور وسیع تر ترقی پسند فکر کے حامل ناقد ہیں۔ انھوں نے ان لوگوں کو بھی اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے جو ترقی پسند نہ تھے یا ترقی پسند فکر کے حامل نہ تھے۔ وہ ادبی محاسن کی قیمت پر کسی فن پارہ کی تحسین نہیں کرتے مگر فنی پہلوؤں کو نظر انداز بھی نہیں کرتے۔ انھوں نے اطہر نفیس، ضیا جالندھری، ن۔م راشد، احمد ندیم قاسمی، ناصر کاظمی کے ساتھ فراقؔ، مجازؔ اور نئی شاعری کے شعرا پر بھی لکھا ہے۔ وہ تنگ نظر ترقی پسندوں پر بھی تنقید کرتے ہیں۔

موضوعات میں تنوع بھی ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی تنقید کا خاصا ہے۔ وہ شاعری، افسانہ، ناول، زبان اور جدید مباحث کے حوالے سے موضوعات کا ایک ادبی جہان بسائے ہوئے ہیں۔ وہ ایک ہمہ جہت ناقد ہیں۔ شاید ہی کوئی موضوع ایسا ہو جن پر انھوں نے کچھ لکھا نہ ہو۔ انھوں نے ہر موضوع اور ہر مسئلے پر شہرت سے بے نیاز ہو کر اپنی تنقیدی اور تحقیقی آرا کا اظہار کیا اور یہی نہیں وہ ہر موضوع سے متعلق اپنی منفرد رائے کا بھی اظہار کرتے ہیں۔ اٹھارہ سے زائد ان کی تصانیف و تالیفات، وسیع تر موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ مرزا غالبؔ، سرسید اور اقبال اور فیضؔ پر مکمل کتب مذکورہ ادبا کی زندگی اور فکر کے گوشوں کو ان کے ہم عصر سماجی تناظر میں دیکھنے کی بھرپور تحقیقی و تجزیاتی سعی ہے۔ ''شاعری کی زبان'' اور ''لسانی مباحث انیسویں صدی تک'' ادبی زبان سے متعلق ان کے نظریات کے بھرپور عکاس ہیں۔ وٹ گن اسٹائن،

ساختیات، پس ساختیات، جدیدیت و مابعد جدیدیت، گذشتہ صدی کے ادبی رجحانات وغیرہ میں ان کی ترقی پسند رائے وقعت کی حامل ہے۔ پھر صدیقی صاحب نے مصوری سے متعلق سو سے زائد مصوروں کی خدمات کا جائزہ لیا جسے حنیف رامے مرحوم نے بہت سراہا۔ یوں ان کے ہاں موضوعات کا ایک وسیع سلسلہ ہے جو ان کی وسعتِ مطالعہ کا ثبوت ہے۔

جب زبان کی حقیقت و اصلیت پر شکوک و شبہات نے وٹ گن اسٹائن نے ہیئت پسندی، ساختیات و پسِ ساختیات کی صورت میں اعتراضات کی بوچھاڑ کی تو محمد علی صدیقی نے فطری زبان کا بھرپور دفاع کیا اور ان اعتراضات کا بھرپور استدلالی جواب دیا۔ جب شاعری کی زبان کو ریاضیاتی زبان سے تبدیل کرنے کی بات ہوئی اور وٹ گن اسٹائن اور اس کے حامیوں نے مثالی اور ریاضیاتی زبان کے وجود کی حمایت کی تو محمد علی صدیقی نے ''شاعری کی زبان'' اور ''لسانی مباحث انیسویں صدی تک'' میں اس کی بھرپور مخالفت کی۔ اپنے تنقیدی مضمون ''شاعری کی زبان'' میں ریاضیاتی یا سائنسی زبان اور شاعری کی زبان میں فرق کے قائل ہیں۔ ان کے خیال میں سائنسی زبان سائنسی علوم سے اپنے دامن کو سیراب کرتی ہے جب کہ ادبی زبان انسانی ذہن اور احساس کے درمیان کش مکش کا نام ہے۔ ریاضیاتی زبان کی جگہ وہ فطری زبان کے قائل ہیں۔ یہاں تک کہ شاعری میں استعمال ہوا ہر لفظ لغت کا حصہ ہوتے ہوئے بھی تخلیق کار کی ذاتی سوچ اور ادائیگی کی وجہ سے اس قدر ذاتی ہو جاتا ہے کہ اگر پڑھنے والا اس لفظ کی جگہ کوئی اور لفظ استعمال کرے تو شاعر کا فکری تسلسل اور اس کی ذاتی پہچان بھی مجروح ہو سکتی ہے۔ محمد علی صدیقی ایک عام سے لفظ ''شام'' کی مثال دیتے ہیں کہ یہ لفظ کس طرح مختلف شعرا کے ہاں مختلف معنوں اور مختلف پہلوؤں میں استعمال ہوا ہے اور پھر وہ مرزا غالب کے شعر:

نقشِ فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کی مثال دیتے ہیں کہ موجودہ پڑھنے والے اور آنے والے قارئین اس شعر سے اپنے اپنے انداز میں مختلف معانی و مفاہیم نکالیں گے تو پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ انسانی آرزوؤں، محبتوں اور وسوسوں کو کسی سائنسی یا ریاضیاتی زبان میں ادا کیا جا سکے۔ وہ ریاضیاتی زبان سے مخالفت کرتے ہیں اور ریاضیاتی اور ادبی زبان میں یوں فرق واضح کرتے ہیں:

> ''انسانی سطح پر بھی ایک ایسا ''ظاہر'' ہے جو باطنی ضروریات سے پھوٹتا ہے اور قابلِ صد سپاس ہے۔ یہ بات کہ ابھی تک انسانوں نے کسی ایسی ریاضیاتی زبان میں اپنی محبتوں، آرزوؤں اور وسوسوں کو اظہار دینا شروع نہیں کیا۔''(۷)

اردو تنقید میں نوام چومسکی کو متعارف کروانے کا اعزاز بھی محمد علی صدیقی کو حاصل ہے۔ وہ نوام چومسکی کی لسانیات کے حوالے سے خدمات کو سراہتے ہیں کہ چومسکی نے اسٹرکچرل ازم اور وٹ گن

اسٹائن کی مثالی زبان کا خالصتاً عقلی دلائل سے جواب دیا۔ صدیقی کے خیال میں نوام چومسکی نے یہ ثابت کیا کہ اگر زبان سے جذبہ اور تاثیر پذیری نکال دی جائے تو پیچھے کچھ نہیں بچتا۔ چومسکی نے پہلی دفعہ یہ آواز بلند کی یہ ادب کے اظہار کے لیے کریٹالوجی کی زبان مناسب نہیں۔ جب وٹ گن اسٹائن نے تحریر سے فالتو الفاظ نکالنے کی بات کی تو اس وقت زبان کو مثالی بنانے کا بہت شور تھا۔ چومسکی نے لسانی تجزیہ میں فاضل الفاظ کی حمایت یہ کہتے ہوئے کی کہ فاضل سمجھے جانے والے الفاظ کو تخلیق کار پر چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ انھیں اس طرح استعمال کرے کہ ذہن علامتی زبان، نفسیاتی تجزیہ اور اشتہارات کی کنکریٹ زبان اور اعصاب شکن واقعیت سے محفوظ رہ سکے۔ چومسکی کے خیال میں ایک پختہ زبان دان اپنی زبان میں کسی بھی نئے جملے کو تخلیق کر سکتا ہے۔ محمد علی صدیقی نے نہ صرف نوام چومسکی کے نظریات کو وضاحت سے بیان کیا بلکہ اس کے فطری زبان کی حمایت میں نظریات کو وٹ گن اسٹائن اور اسٹرکچرل ازم کی تردید کے طور پر بھی پیش کیا۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی چومسکی کی فطری زبان کی حمایت کو اپنے تحقیقی، تجزیاتی، تنقیدی انداز میں یوں پیش کرتے ہیں:

> ''اس شخص نے زبان کے تخلیقی سوتوں کا سراغ پا کر ''ریاضیاتی'' زبان کے اس بت کو پاش پاش کر دیا ہے جسے وٹ گن اسٹائن کے پہلے دور کی فکر نے (وٹ گن اسٹائن آخری دور میں زبان کے بارے میں اپنے نظریات سے تائب ہو گئے تھے) اور اسٹرکچرل ازم کے وکلا نے پروان چڑھایا تھا۔''(۸)

ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے وٹ گن اسٹائن کی ریاضیاتی اور مثالی زبان کی حمایت کی تردید بھی اپنے تحقیقی و تجزیاتی اندازِ نقد کے تحت بھرپور استدلال سے کی ہے۔ جب وٹ گن اسٹائن (۱۹۲۱ء سے ۱۹۵۱ء) نے مثالی زبان کی حمایت کی کہ یہ مابعد الطبیعات اور جذباتی زبان کی مخالفت ہے اور اس نے یہ کہا کہ زبانوں کی ساخت ایک جیسی ہے اور ہر جملہ کے عناصر الفاظ کے مساوی ہونے چاہییں جہاں خیال کے عناصر الفاظ سے زیادہ ہوں گے وہاں انتشار پیدا ہوگا۔ محمد علی صدیقی نے یہ ثابت کیا کہ وٹ گن اسٹائن آخری وقت میں خود ہی اپنی مثالی زبان کی مخالفت اس طرح کر گیا جب اس نے کہا کہ مثالی زبان کے ذریعے مغالطہ دور کرنا آسان نہیں ہے اور پھر اس نے یہ کہا کہ شطرنج کے کھیل کی طرح جوں جوں کھیلتے جاؤ توں توں لسانیات کا کھیل سمجھ آتا جاتا ہے اور یہ کہ افسانے اپنے ہی نظریات سے یہ کہہ کر اس طرح مخالفت کی کہ لسانی تشکیلات ممکن ہیں۔ محمد علی صدیقی کے خیال میں جدید ادب کو کیلکولس (Colculas) کے نظریہ ہیئت پرستی کی ضرورت نہیں اور یہ کہ ہماری تمام تر امنگوں اور ترنگوں کو کسی بھی طرح کے فارمولوں کی زبان میں ادا کرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ ہماری آبادی کا ۷۵ فی صد حصہ ابھی تک متوسط دور کے قصوں اور متصوفانہ خیالات کی روایتی شاعری کو ادب سمجھتا ہے۔ یہ بات حقیقت ہے کہ محمد علی صدیقی نے وٹ گن اسٹائن کی فطری زبان سے مخالفت اور ریاضیاتی زبان کی حمایت سے نہ

صرف اختلاف کیا بلکہ اُردو تنقید میں ان موضوعات کو بھر پور طریقے سے متعارف کروا کر فطری زبان کی حمایت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

اسٹرکچرل ازم (Structuralism) جس کا آغاز صدیقی صاحب بیسویں صدی کے تیسرے عشرے کو قرار دیتے ہیں، یہ نظریہ زبان کو ایک علامتی نظام قرار دیتا ہے جس کے مطابق زبان جس چیز کو نام دیتی ہے اس چیز سے اس لفظی نام کا تعلق ہونا ضروری نہیں۔ نام صرف اشارے کا کام کرتا ہے۔ اس نظریے کے ترجمان فرینینڈ ڈی ساؤسر کے خیال میں زبان کے تاریخی مطالعہ کی نسبت اس کا جمودی مطالعہ بہتر ہو گا۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی اس نظریے سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اسٹرکچرل تنقید تخلیق اور اس کے اسٹرکچرل سسٹم میں دوئی پیدا کرتی ہے اور یہ کہ اس سے عمل اور تخلیق کے درمیان رشتے ختم کر دیے جاتے ہیں اور یہ نظام نظریۂ تاریخ، جدلیت اور سائنسی پیش گوئی پر ضرب لگاتا ہے۔ محمد علی صدیقی ادب میں نظریے کے قائل ہیں۔ ان کے خیال میں نظریے کے بغیر سب کچھ دھندلا ہو جائے گا اور یہ سب وٹ گن اسٹائن اور اسٹرکچرل ازم کے تحت اس لیے کیا جا رہا ہے کہ نظر سے منظر اور لفظ سے معنی جدا کر دیا جائے۔ صدیقی زبان کے معاملے میں تاریخی صداقتوں کے قائل ہیں:

> ''زبان میں بنیادی تبدیلی نہیں ہوا کرتی۔ روسی اور چینی زبانوں میں کیا تبدیلیاں ہوئیں؟ دو تین فی صد الفاظ! یہی ہر زبان کا خاصا ہے۔ خواہ یسوح مسیح کہیں کہ گلاب کا پھول سرخ ہے یا یہ کہے کہ گلاب کا پھول سرخ ہے، سیکڑوں سال کے مکانی و زمانی فرق کے باوجود اس جملے کے مفہوم پر دنیا بھر کے بامعنی اور سسٹم ساز مفکروں کو اتفاق ہے اور یہ بہت بڑا سرمایہ ہے جسے نئی لسانیات۔۔۔ بے معنی نیا فلسفۂ لسان۔۔۔ تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔'' (۹)

روایت کی اہمیت سے کچھ ناقدین چاہے اختلاف کریں مگر روایت کی بحث خاص طور پر تنقید کی ادبی دنیا میں بہت اہمیت کی حامل ہے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی روایت کی اہمیت کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک قدیم کلاسیکی ادب کے جاندار عناصر زندہ روایت کا حصہ ہیں۔ کچھ ترقی پسند ناقدین نے قدیم کلاسیکی ادب کو دریا برد کرنے کی بات کی، مگر محمد علی صدیقی کے نزدیک روایت میں زندگی کو بڑھانے اور ترقی دینے والے عناصر شامل ہوتے رہتے اور غیر تعمیری اور فرسودہ خیالات و نظریات خود بخود نکل جاتے ہیں۔ محمد علی صدیقی روایت کے جاندار عناصر کے قائل ہیں۔ اگر غور کیا جائے شاید کوئی بھی ادیب ایسا نہیں ہے جس نے چاہتے نہ چاہتے ہوئے کسی نہ کسی طرح اپنے سے قدیم ادب اور ادیبوں کی سوچ یا الفاظ سے استفادہ نہ کیا ہو۔ زندگی اور اس کی تمام تاریخ پر بھی نظر دوڑائی جائے تو معلوم ہو گا کہ زندگی کا نظام اپنی تمام تر جدید تبدیلیوں سمیت جدلیت کا قائل ہے۔ اس طرح محمد علی صدیقی کی صحت مند ادبی روایت کی طرف داری اور پاسداری تنقیدی ادبی حوالے سے بہت اہمیت کی حامل ہے۔

ڈاکٹر محمد صدیقی ساختیات (Construction) پر لکھتے ہیں کہ یہ دنیا میں عام رائج تصورات کو چیلنج کرتی ہے۔ سب سے زیادہ عام فہم نظریہ حقیقت نگاری (Realism) کو سمجھا جاتا ہے۔ ساختیات نے سب سے زیادہ سوال اسی پر اٹھائے۔ ساختیات نے ہی یہ اعتراض کیا کہ زبان شفاف میڈیم (Medium) نہیں اور پھر سوسیئر نے کہا کہ آئیڈیالوجی فی نفسہ وجود ہی نہیں رکھتی۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی ساختیات کو اس لیے رد کرتے ہیں کہ یہ تحریک ادبی مطالعہ سے سماجی تحلیل و تجزیہ کو بھی دور کرتی ہے۔ صدیقی نے درحقیقت ساختیات کے پس پردہ مغربی سیاسی، ایجنڈے کو بھانپ لیا تھا۔ وہ اسٹرکچرل ازم، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کو اینٹی ایجنڈے کا قائل قرار دیتے ہیں۔ یہ لامرکزیت کی طرف لے جا کر تیسری دنیا کے غریب ممالک کو سائنسی ترقی و ٹیکنالوجی سے بیزار کرتی ہے تاکہ نہ تو یہ غریب ممالک کسی اجتماعی بہتری کی سوچ کی طرف آسکیں اور نہ ان کی نظر اپنے مسائل کی طرف جائے۔

محمد علی صدیقی انفرادیت کے بجائے اس ادب کو ترجیح دیتے ہیں جو اجتماعیت کا علم بردار ہو جو اجتماعی مفاد اور مجموعی طور پر لوگوں کے دُکھ درد، غم اور خوشی سے کسی نہ کسی حوالے سے تعلق رکھتا ہو۔ اسی لیے وہ ادب میں نظریے کے قائل ہیں اور ادب برائے ادب کے بجائے ادب برائے زندگی کی حمایت کرتے ہیں۔ مگر انھوں نے کبھی بھی فن کی اہمیت کو اپنی تنقید میں نظر انداز نہیں کیا۔ وہ غالبؔ، اقبالؔ، فیضؔ اور جوشؔ پر مکمل کتب تصنیف کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ جتنے بھی شعرا یا ادیب ان کی تنقید کا حصہ بنے ان کی فنی ادبی خوبیوں کو انھوں نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس طرح وہ بہت سے تنگ نظر ترقی پسندوں کے برعکس جنھوں نے ادیب کے فن کو فکر کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں دی، ادیب کے ادبی و فنی پہلوؤں اور خصوصیات کو اہمیت دی ہے۔ یہی خصوصیت محمد علی صدیقی کو جدید ترقی پسند ناقدین میں معتبر اور قابلِ ستائش مقام سے ہمکنار کرتی ہے۔ وہ جدیدیت، مابعد جدیدیت اور پسِ ساختیات سے اسی لیے اختلاف کرتے ہیں کہ یہ تحاریک نظریے کی اہمیت کو رد کرتی ہیں۔ انسانی ترقی اور سائنس سے بیزار ہیں اور آخرِ کار انسان کو لایعنی اور لاحاصل انجام تک لے آتی ہیں۔

محمد علی صدیقی جدیدیت (Modernism) کو اسی لیے رَد کرتے ہیں کہ یہ اجتماعی نصب العین، حقیقت نگاری اور معاشرتی منظر نامہ کو نظر انداز کرتی ہے۔ پھر یہ صحت مند ماضی کی روایت کے بھی خلاف ہے اور جدیدیت کے مطابق فن کار قاری کا محتاج نہیں ہوتا، فن کار جو کچھ لکھتا ہے اپنی ذات کی تسکین کے لیے لکھتا ہے نہ کہ پڑھنے والے کے لیے۔ محمد علی صدیقی اپنے مضمون ''جدیدیت اور روایت'' میں محمد حسن عسکری کے اس قول کی تردید کرتے ہیں جس میں عسکری نے کہا کہ سائنس بذاتِ خود مادی ہے اور جو چیز بھی مادہ پرستی کے قریب آ جائے وہ ناپاک ہے۔ روایت کا وہ تصور جو انسان کی مادی ترقی سے بیزار ہے، جو سائنسی ترقی اور سائنسی ایجادات کو دل سے قبول نہیں کرتا، محمد علی صدیقی کو اس سے شدید اختلاف ہے۔ صدیقی کی رائے میں جدیدیت کے زیرِ اثر بیشتر ادبی تخلیقات خلا میں اپنا وجود رکھتی

ہیں اور سائنسی ترقی سے بیزار ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جدیدیت نواز لوگ نظم اور فن پارے کو خود مختار کہہ کر اسے اس کے سماجی، سیاسی اور عصری تناظر سے کاٹ دیتے ہیں:

> ''جدید ہونے کا دعویٰ صرف وہی ادیب کر سکتا ہے جو سائنسی اکتسابات اور تقاضوں پر برہم ہونے کی بجائے ان سے کھلے دل و دماغ کے ساتھ معاملات کرے۔ ماضی میں پناہیں ڈھونڈنے والے اور زمانۂ حال کی رست خیز سے آنکھیں چرانے والے کس طرح جدید ہو سکتے ہیں۔''(۱۰)

مابعد جدیدیت (Post Modernism) لامرکزیت پر یقین رکھتی ہے اور اسی طرح پسِ ساختیات (Deconstruction) میں بھی معنی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ ایک معنی اپنے سے پہلے موجود معنی کو رد کرتا ہے اور یہ سلسلہ کسی انتہا تک نہیں پہنچتا۔ مابعد جدیدیت اسی معنی کی کثرت سے عبارت ہے اور یہ وحدت کے خیال سے دور بھاگتی ہے۔ محمد علی صدیقی کے نزدیک مابعد جدیدیت اور ردِ تشکیل کثیر المعنویت پر یقین رکھتی ہے اور اسے انجام کار لا حاصل کی طرف جانا پڑتا ہے۔ مابعد جدیدیت سائنسی ٹیکنالوجی کو ترقی کی بنیاد نہیں مانتی۔ مابعدِ جدید کے نزدیک مغربی معاشرہ جو اپنی سائنسی ترقی و ٹیکنالوجی کی بدولت دنیا پر حکمرانی کر رہا ہے وہ مغالطے کا شکار ہے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے خیال میں ساختیات، پسِ ساختیات، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے تحت صرف ترقی پذیر ممالک کو اپنی ترقی کی فکر اور سوچ سے دور رکھنے کی سازش ہے تاکہ یہ ممالک نہ کسی مرکز پر آسکیں اور نہ کسی نظریے کے قائل ہوں اور یوں ہی اپنے حالات پر کڑھتے رہیں اور ان کی توجہ اپنے بنیادی مسائل اور جدید طریقہ ہائے صنعت، تجارت اور ٹیکنالوجی کی طرف نہ جائے۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی ادبی تنقیدی بصیرت کا جائزہ لیا جائے تو وہ جدید ترقی پسند تنقید میں نمایاں حیثیت کے حامل تو ہیں ہی، جدید تنقیدی ادبی ناقدین کی صف میں بھی وہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ دراصل اپنی وسعتِ مطالعہ، وسیع المشربی اور کشادہ و کھلا ذہن رکھنے والے ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے نہ صرف ترقی پسند نقطۂ نظر سے گہری وابستگی کا ثبوت دیا بلکہ کچھ تنگ نظر ترقی پسندوں کے برعکس ترقی پسندوں سے مختلف نقطۂ نظر رکھنے والے ادیبوں اور ناقدین کی آرا کو بھی احترام کی نظر سے دیکھا۔ صدیقی نے تنقید میں تحقیق کی بدولت سائنٹفک تنقیدی طریقہ کار اپنایا۔ انھوں نے نہ صرف ترقی پسندانہ فکر کے دامن کو وسیع کیا بلکہ ترقی پسندی کو وسیع تناظر میں متعارف کرایا۔ لہٰذا انھوں نے ترقی پسند تنقید میں نظریے کی اہمیت اور ادب برائے زندگی کے قائل ہوتے ہوئے بھی ادبی وفنی خصوصیات کو اہمیت دی۔ ماضی کے ادب کو بھی احترام کی نظر سے دیکھا اور صحت مند ادبی روایت کی پاسداری بھی کی۔ نظری مباحث، جدیدیت، ساختیات، ردِ تشکیل، مابعد جدیدیت، مابعدِ نوآبادیات اور لسانی نظریات سے متعلق وٹ گن اسٹائن کی مثالی زبان کی حمایت کا نہ صرف عقلی و منطقی انداز میں جواب دیا بلکہ وہ ترقی پسند نظریے کو جاندار

ادبی نظریے کے طور پر زندہ بھی رکھے ہوئے ہیں۔ نظری مباحث سے متعلق ان کی دو ٹوک آرا بڑی وقعت کی حامل ہیں۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی آج بھی ترقی پسند فکر کے قائل ہیں اور ان کے خیال میں ترقی پسندانہ سوچ کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ وہ جدید ناقدین کی صف میں اپنے وسعتِ مطالعہ، تحقیقی، تجزیاتی، سائنٹفک تنقیدی انداز، لسانی و نظری مباحث پر نظر رکھنے، متنوع موضوعات کو اپنی تنقیدی بصیرت کا حصہ بنانے کی بدولت جدید اُردو تنقید کی روایت میں منفرد رائے رکھنے والے معتبر ناقد ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، دیباچہ: جوش ملیح آبادی ایک مطالعہ، کراچی: ارتقا، ۲۰۰۶ء

۲۔ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، توازن، کراچی: ادارہ عصرِ نور، ۱۹۷۶ء، ص: ۲۲۵

۳۔ انوار احمد، ڈاکٹر، محمد علی صدیقی: اردو تنقید میں ایک معتبر نام، مشمولہ: توازن کی جہات، مرتبہ: ڈاکٹر قاضی عابد، ملتان: سعیدی پرنٹنگ پریس، ۲۰۰۷ء، ص: ۱۶

۴۔ شہزاد بیگ، مرتب: ڈاکٹر طاہر تونسوی۔ ایک مطالعہ، فیصل آباد: اکائی پبلشرز، ۲۰۰۵ء، ص: ۳۷

۵۔ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، نشانات، کراچی: ادارۂ عصرِ نور، ۱۹۸۱ء، ص: ۲۲۸

۶۔ چہار سو، ماہنامہ، راولپنڈی: جلد ۱۰، شمارہ جولائی اگست ۲۰۰۶ء، ص: ۱۱

۷۔ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، نشانات، کراچی: ادارۂ عصرِ نور، ۱۹۸۱ء، ص: ۱۳۸

۸۔ ایضاً، ص: ۱۲۹

۹۔ ایضاً، ص: ۱۲۹

۱۰۔ ایضاً، ص: ۱۲۹

☆......☆......☆